بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پچھلے دنوں مشرقی پاکستان میں جو ہلاکت خیز طوفان آیا ہے اور اس سے جان و مال کا جو زبردست زیاں ہوا ہے، اُس کے تصور سے انسانی رُوح کانپ اٹھتی ہے۔ تند و تیز ہوا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تلاطم نے گزشتہ دو صدیوں میں کہیں اتنی تباہی نہیں مچائی جتنی پاکستان کے مشرقی بازو میں اب دیکھنے میں آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے اور انہیں ارضی و سماوی آفات سے محفوظ رکھے۔ اسی کے کرم پر بندوں کی زندگی کا انحصار ہے، کیونکہ کائنات کا پورا انتظام اُسی قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ یہ تباہی اس نوعیت کی ہے کہ اس سے پوری انسانیت تڑپ اٹھی ہے اور دنیا کے قریب قریب ہر ملک نے اس سے متاثر ہونے والوں کی اعانت اور دستگیری کے لیے ہاتھ بڑھایا ہے۔ مگر یہ بربادی اس قدر زیادہ ہے کہ ان سب کی مجموعی پیش کش بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ اس سلسلے میں مسلمان حکومتوں کو غیر معمولی فیاضی کا ثبوت دینا چاہیے، کیونکہ یہی وہ مواقع ہیں جن میں دینی اخوت اور بھائی چارے کے جذبات کو پوری طرح بروئے کار آنا چاہیے۔ جہاں تک اہلِ پاکستان کا تعلق ہے یہ تو ان کے گھر کی بربادی ہے۔ اس لیے جو لوگ بھی اس کی زد سے محفوظ رہے ہیں، خواہ ان کا تعلق مغربی پاکستان سے ہے یا مشرقی پاکستان سے، انہیں اپنی سلامتی پر خدا کا شکر کرنا چاہیے اور اپنے ان تباہ حال بھائیوں کی بھرپور امداد کرنی چاہیے جو اس آفت کے شکار ہوئے ہیں۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ اگر خدانخواستہ یہ مصیبت ان پر ٹوٹ پڑتی تو ان کا کیا حشر ہوتا اور یہ دولت جس کی محبت میں وہ گرفتار ہیں ان کے کس کام آتی۔ اس قومی مصیبت کے وقت پاکستان کے ہر فرد

کو زیادہ سے زیادہ ایثار سے کام لینا چاہیے اور تعیشات اور آسائشات کی قربانی تو ایک طرف اپنی ضروریات تک کو قربان کر کے اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی امداد کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔

ان حالات میں حکومت پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کام کی طرف سب سے زیادہ توجہ دے اور اگر اسے اپنے دوسرے کاموں یا منصوبوں کو وقتی طور پر نظر انداز بھی کرنا پڑے تو کر دے۔ یہ تباہی اور بربادی اس قدر زیادہ ہے کہ جب تک حکومت اس کام کی طرف پورے انہماک سے متوجہ نہ ہو گی اس وقت تک ستم زدہ افراد کی بحالی کا کام خاطر خواہ انداز سے سرانجام نہ دیا جا سکے گا۔ اس کام کے لیے مالی امداد کے علاوہ اس بات کی بھی اشد ضرورت ہے کہ معاونت و دستگیری کا یہ فرض ایسے کارندوں کے سپرد کیا جائے جو مستعد اور ایماندار ہونے کے علاوہ اپنے اندر افسریت کی خو بو نہ رکھتے ہوں بلکہ اپنے پہلو میں حساس اور دردمند دل رکھتے ہوں اور اس کام کو پوری احساسِ ذمہ داری اور دلسوزی کے ساتھ سرانجام دینے کے لیے تیار ہوں۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ایسے کارندے روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں مگر ان کا فقدان بھی نہیں ہے۔ اگر حکومت تھوڑی سی کوشش کرے تو اسے انسانیت کے بہی خواہ کارندوں کی اچھی خاصی تعداد مہیا ہو سکتی ہے۔

اس سلسلے میں حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ پوری سنجیدگی سے سیلاب کے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے جو ہر سال بلکہ کبھی کبھی سال میں کئی بار مشرقی پاکستان کے باشندوں کے لیے تباہی و بربادی کا سامان بنتا ہے۔ اس مصیبت سے آخر نجات کی کوئی مؤثر صورت پیدا کرنی چاہیے۔

دنیوی تدابیر کے ساتھ ہم پاکستان کے باشندوں کو اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو پوری کائنات کا خالق، مالک اور حاکم ہے۔ کائنات کی کوئی چھوٹی بڑی چیز یا قوت ایسی نہیں جو براہِ راست اس کے قبضۂ قدرت میں نہ ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جلیل القدر صحابہؓ ہمیشہ اپنے خالق سے رحمت کی دعائیں مانگتے رہتے تھے اور جب بھی کائنات کے تیور ذرا بدلتے ہوئے دیکھتے یا مظاہرِ کائنات

میں کوئی غیر معمولی حرکت محسوس کرتے تو فوراً بارگاہِ ایزدی میں گڑگڑا کر دعائیں مانگتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں احادیث میں مذکور ہے کہ جب بھی فضا میں برق و باراں یا آندھی کے آثار آپ کو نظر آتے تو آپ کا رنگ متغیر ہو جاتا اور بڑے اضطراب کے عالم میں رحمتِ خداوندی کے طلبگار ہوتے اور اس کے عذاب سے پناہ مانگتے:

اَللّٰھُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُھْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذَالِكَ

جس طرح تعمیر کی متعدد صورتیں ہیں اسی طرح تخریب اور خلفشار کے بھی مختلف راستے ہیں بعض راستے تو بڑے صاف اور واضح ہیں اور ایک انجان سے انجان آدمی بھی انہیں دیکھ کر ان خطرات کو فوراً بھانپ لیتا ہے جو ان راستوں پر چلنے سے اُسے پیش آسکتے ہیں۔ مگر تخریب کی بعض راہیں اتنی پُرپیچ ہیں کہ اُن کے نشیب و فراز کو عوام آسانی سے نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اپنی دانست میں فلاح و کامرانی کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں مگر درحقیقت وہ تباہی و بربادی کی طرف بڑھتے ہیں۔ شیطان انسان کو فریب دینے اور اسے ناکام بنانے کے لیے جو گہری چالیں چلتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بعض انسانوں کو سب سے پہلے بعض کاموں کے بارے میں بھلائی کے بڑے سہانے خواب دکھاتا اور بڑی دلفریب اور خوش آئند امیدیں وابستہ کرواتا ہے مگر جب نتائج ان کی حسبِ منشا نہیں نکلتے تو انہیں مایوسی کا شکار کر دیتا ہے اور پھر اپنی اس فتح مندی پر بڑا خوش ہوتا ہے۔

شیطان تو خیر ہے ہی انسان کا ازلی دشمن۔ مگر افسوس کے قابل اُن لوگوں کی حالت ہے جو اس کے فریب میں آکر خواہ مخواہ کسی فرد یا گروہ یا کسی کام سے ایسی غلط قسم کی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں جن کے سو فیصد پورا ہونے کے دُور دُور تک امکانات نہیں ہوتے۔ اور پھر جب انہیں کسی حد تک ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو یاس و قنوطیت کا شکار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور تعمیری اندازِ فکر کو چھوڑ کر منفی اندازِ فکر اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ خواہ کتنے مخلص ہوں مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ اندازِ فکر عملی زندگی کے لیے کسی طرح بھی

مفید نہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ انداز مایوس ہونے کے لیے ہی اختیار کیا جاتا ہے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ اس کی مثالیں ہمیں معمولی افراد سے لے کر نامور شخصیات تک اور عام واقعات سے لے کر بڑے اونچے قومی مسائل تک میں بکثرت ملتی ہیں۔ مثلاً آپ زندگی میں ایک شخص سے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ اس شخص کی عام روش بڑی اچھی ہے۔ اس نے آپ کے ساتھ اکثر اوقات بھلائی کا معاملہ کیا ہے۔ مگر کبھی اس سے لغزش ہو جاتی ہے تو کیا آپ کا سوچنے کا یہ انداز صحیح کہا جا سکتا ہے کہ آپ اس کی ایک لغزش کو دیکھتے ہوئے نہ صرف اس سے بگاڑ پیدا کر لیں گے اور اس کے خلاف ایک مہم چلائیں بلکہ پوری انسانیت سے مایوس ہو کر بیٹھ جائیں اور انسان کے بارے میں یہ تصور اپنے ذہن میں راسخ کر لیں کہ آدمی نیک اور بھلا ہو سکتا ہی نہیں، درآنحالیکہ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ جس چیز کو آپ لغزش سمجھ رہے ہیں وہ لغزش ہی نہ ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی نظر میں اس سے کوئی کوتاہی ایسی ہوئی ہے جس نے آپ کو مایوس کیا ہے، مگر اس میں ایک غلطی آپ کی بھی ہے جو کسی اعتبار سے کم سنگین نہیں کہ آپ نے اُس شخص سے ایسی توقع وابستہ کر لی جس کے لیے آپ کے پاس کوئی جواز نہیں۔ آخر آپ نے یہ کیوں فرض کر لیا کہ بھلے آدمی سے بھولے سے بھی کوئی لغزش سرزد نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی شاعرانہ توقعات مایوسی کی آغوش میں پناہ لینے کے لیے ہی تو انسان پیدا کرتا ہے۔

مسلمان جو کبھی دنیا کے سب سے زیادہ حقیقت پسند انسان تھے آج بدقسمتی سے ہر مرحلے اور ہر گام پر ہر تحریک اور ہر فرد یا گروہ کے بارے میں توقعات کے اس قسم کے شاعرانہ طلسمات میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ وہ پہلے کسی فرد یا کام کے بارے میں خوابوں کے محل تعمیر کرتے ہیں مگر پھر معمولی دھچکے کے ساتھ فوراً ہی انہیں پیوندِ خاک کر دیتے ہیں اور اپنے اندازِ فکر کی کوتاہی پر غور کرنے اور آئندہ محتاط رہنے کے بجائے ان جھوٹی آرزوؤں اور تمناؤں کے مرقد بنا کر اُن پر دھونی رما کر بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ گزشتہ سو سال کی تاریخ کا جائزہ لیں تو آپ کو اس قسم کی مایوسی کی کئی ایک مثالیں ملیں گی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جسے "غدر" کا نام دیا جاتا ہے مسلمانوں کو ناکامی ہوئی تو اس ناکامی کے اسباب پر غور کرنے

اور اس جد و جہد کو ایک دوسرے انداز سے آگے بڑھانے کے بجائے وہ بالکل مایوس ہو کر بیٹھ گئے اور قوم کے ایک اچھے خاصے طبقے نے انگریز سے تعاون کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ یہ اندازِ فکر درحقیقت خود اعتمادی کے ختم ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اسی طرح تحریکِ خلافت کے بارے میں بھی غلط قسم کی توقعات وابستہ کی گئیں اور جب ان میں ناکامی ہوئی تو مسلمانوں کے لیے پاک و ہند کی سرزمین سیاسی اعتبار سے قریب قریب بیس سال تک ویرانہ بنی رہی۔ یہاں کے مسلمانوں نے یہی طرزِ عمل دوسری تحریکات کے بارے میں بھی اختیار کیا اور کبھی حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اس امر کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی کہ جن اجزائے ترکیبی کے ساتھ وہ کسی جماعت کی تشکیل کر رہے ہیں اور اس کے اندر جس مزاج کو پروان چڑھا رہے ہیں اور پھر اُسے جس ماحول اور جن داعیات کے ساتھ آگے بڑھا رہے ہیں کیا اُس سے اِن کی توقعات پوری ہو سکتی ہیں۔

یہی غیر حقیقت پسندانہ طرزِ فکر پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے کے بعد بھی قائم رہا یہاں جو فرد بھی کسی خوش کن دعوے کے ساتھ اُٹھا لوگ دیوانہ وار اس کے پیچھے لگ گئے اور اسے دیکھتے دیکھتے قوم کا نجات دہندہ بنا ڈالا۔ اور جس شخص نے جذبات کی اس شدت میں عوام کو عقل کی بات سُجھائی اسے گردن زدنی قرار دیا گیا۔ خاص طور پر فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب کے لائے ہوئے فوجی انقلاب کے بارے میں عوام نے آغاز میں جس سطحی جذباتیت کا ثبوت دیا وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ اس غیر آئینی انقلاب سے بڑی عجیب و غریب توقعات وابستہ کی گئیں اور اپنے ذہنوں میں خواب و خیال کی یہ دنیا آباد کر لی گئی کہ اب پاکستانی عوام کے سارے دکھوں کا مداوا ہو جائے گا۔ اس ملک میں عدل و انصاف کی حکمرانی ہو گی، رشوت، ظلم و استبداد کا قلع قمع ہو گا اور ناجائز استحصال کی ہر صورت حرفِ غلط کی طرح مٹا دی جائے گی۔ یہ وہ مقدس اُمیدیں تھیں جو اس فوجی انقلاب کے ساتھ وابستہ کی گئیں ان خوش کن توقعات کے ہجوم میں بہت کم لوگ ایسے تھے جنہوں نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے صحیح صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس انقلاب کے مضرت رساں پہلو یا تو عوام کی نظر سے اوجھل تھے

یا ان میں سے بعض افراد اس انقلاب کے بارے میں ایسے طلسم ہوشربا میں گرفتار ہو چکے تھے کہ وہ اس سے آزاد ہو کر تلخ حقائق کو دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ اس قسم کی خوش فہمیاں صرف اس انقلاب کے بارے ہی میں نہ تھیں بلکہ خود اس انقلاب کے برپا کرنے والے کے متعلق بھی قائم کر لی گئیں۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اس شخص نے ملک میں جمہوری قدروں کو فوج کے بل بوتے پر پامال کرنے کی جو ریت قائم کی اور اس سے قوم کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس چیز کو اُس وقت بالکل درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا بلکہ ہر طرف تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسائے جانے لگے مگر جب اس آمریت کے نتائج سامنے آئے اور عوام میں اس سے گلو خلاصی کی آرزو پیدا ہوئی تو اس وقت بھی اس جدوجہد میں جذباتیت کا رنگ نمایاں ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوریت کی منزل جو بالکل قریب تھی دُور ہو گئی۔

اب اسی سطحی جذباتیت کا مظاہرہ ان انتخابات میں کیا جا رہا ہے جو ہماری قوم کے لیے فیصلہ کُن اہمیت رکھتے ہیں۔ ہم کسی رہنما یا کسی پارٹی کو ملک کی زمامِ کار سونپتے ہوئے اس بات کو دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کر رہے کہ اس لیڈر اور اس پارٹی کی سابقہ خدمات کا بھی جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ انہوں نے ماضی میں قوم کے ساتھ کس اخلاص کا ثبوت دیا ہے اور اب وہ جس قسم کے خوش کُن وعدوں کے ساتھ تختِ اقتدار پر براجمان ہونے کی کوشش کر رہے ہیں کیا دنیائے عمل میں وہ وعدے پُورا کرنا ممکن بھی ہے۔ جو شخص زبان کے معاملے میں ذرا مطلق العنان ہو اور جو عوام کے جذبات کے ساتھ کھیلنے کے ڈھنگ جانتا ہو۔ ہماری قوم اسے فوراً "میرِ کارواں" بنا لیتی ہے اور اس سے ایسی امیدیں وابستہ کر لیتی ہے جو اس عالمِ واقعات میں پُوری ہونی ممکن نہیں ہوتیں۔ مثلاً ایک شخص اور اس کی جماعت کے بیشتر افراد کی زندگیاں اسلام سے انحراف کی تصویریں ہیں اور یہ جماعت اپنے کارکنوں کی جس انداز پر تربیت کر رہی ہے اُس سے اسلام کے بجائے لادینیت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ پھر اس جماعت کے لیڈر سے لیکر معمولی کارکنوں تک میں قول و فعل کا واضح تضاد نظر آتا ہے۔ اس سے یہ توقع رکھنا

کہ اس کے برسرِ اقتدار آنے سے اسلام کا تسلط قائم ہوگا یا غریب کی گھڑی بن جائیگی ایک ایسی سادگی ہے جس کے ڈانڈے حماقت اور بیوقوفی سے جا ملتے ہیں۔ اس جماعت کی عملی روش کو دیکھتے ہوئے بھی اگر عوام کی آنکھیں نہ کھلیں اور وہ اس کے خوش کن دعووں کے دامِ فریب میں گرفتار رہنا پسند کریں اور بعد میں جب نتائج ان لوگوں کی اِن خواہشات اور آرزوؤں کے بالکل برعکس برآمد ہوں تو پھر مایوسی کا شکار ہو کر بیٹھ جائیں تو اس میں قصور کسی اور کا نہیں بلکہ خود اُن کا اپنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور غور و فکر کی جو صلاحیتیں عطا کی ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ انسان کے اندر حالات کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو اور وہ آنکھیں بند کر کے دنیا میں زندہ رہنے کے بجائے بصیرت کی آنکھیں کھول کر زندہ رہ سکیں۔ اگر انسان چند تنکوں سے ہوا کے رُخ کا اندازہ لگانے کی اہلیت رکھتا ہے تو وہ کسی فرد یا جماعت کے رویّے سے اس کے عزائم کا آخر کیوں پتہ نہیں لگا سکتا؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان دلفریب خوابوں کی دنیا میں رہ کر لذّت محسوس کرتا ہے اور تلخ حقائق سے دوچار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا ورنہ قدرت نے تو آنکھیں کھولنے کا قدم قدم پر سامان کر رکھا ہے۔ قدرت آگ سے پہلے فضا میں دُھواں اٹھاتی ہے تاکہ آنے والے خطرے کو بھانپا جا سکے۔ اب اگر انسانوں کا کوئی گروہ دھوئیں کے بادل تو کیا آگ کے شعلوں کو دیکھ کر بھی حالات کی سنگینی سے غافل رہتا ہے تو اس غفلت کی سزا یہی ہے کہ وہ دنیا میں نامرادیوں کا شکار ہو کر رہے۔

یاس و قنوطیت کی ایک شکل تو وہ ہے جس میں انسان خود اپنی حماقت سے گرفتار ہوتا ہے۔ مگر چونکہ یہ ایک ایسا خوفناک مرض ہے جو کسی قوم کو اندر ہی اندر سے کھا جاتا ہے اس لیے دنیا کے چالاک اور عیار لوگ اکثر اوقات ایک منصوبے کے تحت اس کے جراثیم لوگوں کے دل و دماغ میں داخل کرتے ہیں۔ اس کی ایک صورت تو بالکل سیدھی سادھی ہے کہ جہاں بیٹھے اور جس جگہ گفتگو کا موقع ملا وہیں عوام کے اندر کسی بھلائی کے کام کے بارے میں مایوسی اور بددلی پھیلانے کی کوشش کی۔ آپ اگر معاشرے کے اندر چل پھر کر دیکھیں تو آپ کو اس طرح مسلمانوں کے ایمان کو نقب لگانے والے کئی افراد ملیں گے۔ جب بھی اُن سے بات کیجیے وہ یہی کہتے سنائی

دیں گے کہ اب بھلا اسلامی نظام کیسے آسکتا ہے؟ معاشرہ سخت بگڑا ہوا ہے اور کفر کی طاقتیں بہت مضبوط ہیں۔ حالات کی یہ تصویر ایک حد تک اپنی جگہ درست ہے مگر اس سے جو نتائج اخذ کیے جاتے ہیں وہ بالکل غلط ہیں۔ آخر اسلام کو برپا کرنے کے لیے جو کوشش کی جارہی ہے وہ اسی وجہ سے تو کی جارہی ہے کہ لوگ الحاد کا شکار ہو رہے ہیں اور اس مرض نے اُن کے ایمان کو کمزور کر دیا ہے۔ پھر یہ بات بھی قطعاً صحیح نہیں کہ اب اسلامی نظام نافذ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ نظام اللہ کا عطا کردہ ہے اور اس وجہ سے یہ انسانی فطرت کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور اس کے مزاج سے زیادہ قریب ہے۔ کفر و الحاد انسان کی فطرتِ سلیم سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ وہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ اگر انسان بہک کر کفر اختیار کر سکتا ہے تو وہ صحیح دل و دماغ کے ساتھ آخر اسلام کیوں اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ فرض کر لینے کے لیے آخر ہمارے پاس کیا جواز ہے کہ انسان صرف بہکنے ہی کے لیے پیدا ہوا ہے اور وہ کبھی صحیح انداز پر سوچنے اور کام کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ انسان کی فطرت کے بارے میں یہ گھناؤنا اور تاریک تصور تو عیسائیت اور اشتراکیت نے دیا ہے۔

پھر ہم عملی زندگی میں بھی اس مایوسی کے لیے کوئی معقول وجہ جواز نہیں پاتے۔ اسلامی نظام چند سال نہیں بلکہ صدیوں قائم رہا ہے۔ فرق جو کچھ ہوا ہے وہ یہ تھا کہ جب اس نظام کو چلانے والے بہتر ہاتھ مہیا ہو گئے تو اس میں وہ آب و تاب پیدا ہو گئی جو ہمیں خلافتِ راشدہ اور خلافتِ عمر بن عبدالعزیزؒ کے مثالی دور میں نظر آتی ہے اور جب بگڑے ہوئے لوگ اس میں تختِ اقتدار پر فائز ہوئے تو اس کی ضیا پاشیوں میں قدرے کمی آگئی۔ دوسرے ممالک کو تو چھوڑ دیجیے، خود اس نیم برِ اعظم میں عوام اس نظام کی برکات سے صدیوں فیضیاب ہوئے اور ان میں بعض ادوار تو ایسے گزرے کہ انہیں دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا خلافتِ راشدہ کا دور اپنی رحمتوں کے ساتھ پلٹ آیا ہے۔ مثلاً ناصر الدین محمود کا عہدِ حکمرانی، جس کے درمیان اور خلافتِ راشدہ کے مابین صدیوں کا فاصلہ ہے، اسلامی نظام کا درخشندہ نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ مورخین نے اس امر کا اعتراف کیا کہ اس عہد میں عوام کے اندر اتنی پرہیزگاری، خدا ترسی اور نیکی کا جذبہ پیدا ہوا اور آسمان سے اتنی برکات کا نزول ہوا کہ ایک انسان اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ ناصر الدین محمود تو خیر بالکل درویش تھا۔ جلال الدین خلجی، فیروز تغلق، شیر شاہ سوری اور اورنگ زیب عالمگیرؒ

کے ادوارِ حکمرانی بھی دینی اور اخلاقی اعتبار سے اسلام کے اجتماعی نظام کی نہایت عمدہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔

ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر وہ نظام جسے خالقِ کائنات نے بنایا ہے جس کے اصول و ضوابط کے صحیح ہونے پر خود انسان کی فطرت گواہی دیتی ہے جس کے درخشندہ نمونے تاریخ کے صفحات میں بکثرت موجود ہیں اور جس کی مثالی صورت ہر مسلمان کے دل و دماغ پر مرتسم ہے، اس کے بارے میں تو مایوسی کا اظہار کیا جاتا ہے اور جو نظام انسانی فطرت سے مطابقت بھی نہیں رکھتا جس کی تخلیق چند غیر متوازن ذہنوں نے کی ہے جو اپنی مثالی صورت میں ایک لمحہ کے لیے بھی عالمِ واقعات میں قائم نہیں ہوا اور جس کی تباہ کاریوں سے ایک دنیا واقف ہے اس سے خوش کن توقعات وابستہ کرکے اسے نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلامی نظام کے بارے میں یہ مایوسی بڑے ناپاک مقاصد اور مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے پھیلائی جاتی ہے۔

مسلم معاشرے میں مایوسی کی فضا پیدا کرنے کے لیے دوسری تکنیک یہ ہے کہ جو جماعتیں اسلام کی علمبردار ہیں یا جو افراد اسلام کی سربلندی کے لیے کوشاں ہیں ان کے خلاف بے سروپا باتیں عوام میں مشہور کی جائیں اور اس معاملے میں اس قدر جھوٹ بولا جائے کہ عوام اسے سچ سمجھ کر قبول کرنے لگیں۔ مگر اس معاملے میں بھی عوام کو صحیح صورتِ حال پر غور کرنا چاہیے۔ ہم دعوے سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ "ملا" جسے آج پوری قوت سے ذلیل کیا جا رہا ہے، بحیثیتِ مجموعی کفر کے علمبرداروں سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس بیچارے نے بے سروسامانی کے ساتھ انگریزی استبداد کا مقابلہ کیا اور سخت غربت اور افلاس کے عالم میں دین کی شمع روشن رکھنے کی کوشش کی جب متاعِ دنیا کے طلبگار انگریز کی خدمت و چاکری کرکے جاگیریں حاصل کر رہے تھے۔ ذرا حساب لگا کر دیکھیے کہ رشوت، غبن، خیانت، ظلم، بے انصافی، اقربا نوازی اور قومی مفاد سے غداری کا کتنا ارتکاب "ملا" کرتا ہے اور کتنا اس کو گالیاں دینے والے یہ روشن خیال ہمدردانِ قوم کرتے ہیں۔ قومی دولت کی لوٹ کھسوٹ "ملا" کرتا رہا ہے یا یہ مسٹروں کا کارنامہ ہے؟ سرمایہ دارانہ نظام "ملا" چلا رہا ہے یا مسٹر؟ قتل و غارت، ڈاکہ زنی، بھتہ گیری اور دوسرے جرائم کو فروغ "ملا" کی سرپرستی میں ہو رہا ہے یا مسٹر کی؟ لیکن اسلام سے مسلمانوں کو بدظن اور مایوس کرنے کے لیے دیندار طبقے کے خلاف ایک مسلسل پروپیگنڈا ہے جو ہمارے ملک میں کیا جا رہا ہے، اور مقصد یہ ہے کہ جو طبقہ اب تک کی تمام خرابیوں کا اصل ذمہ دار ہے اس کے دامِ فریب میں لوگ ہمیشہ گرفتار رہیں۔

مایوسی پھیلانے کا تیسرا حربہ جو حقیقت میں گہری سازش ہے اور جس سے مسلمانوں کو پوری طرح چوکنا اور خبردار رہنا

چاہیے یہ ہے کہ اس انتخاب کے نتائج سے عوام کو بددل کیا جائے۔ اگر خدانخواستہ غیر اسلامی عناصر غالب آجائیں تو پھر اسلامی قوتوں کو اس طرح دبا دیا جائے کہ وہ مستقبل میں اُٹھنے نہ پائیں، اور اگر وہ مغلوب ہو جائیں تو پھر اسمبلی کے باہر ایسی فضا پیدا کر دی جائے کہ یہ نمائندہ ادارہ اپنا کام بخوبی سرانجام نہ دے سکے۔ اس فتنے کے جو عناصر اسمبلی کے اندر جا سکیں وہ وہاں تعطل پیدا کریں اور قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالیں۔ وہ باقی فتنہ پرداز باہر رہ کر عوام کو ہنگامہ آرائی پر آمادہ کر کے اسمبلی کے کام کو معطل کرنے کی کوشش کریں۔ اور اگر بالفرض اس میدان میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہ ہو تو مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے اور ان کے مستقبل کو تاریک بنانے کے لیے تیسرا شیطانی حربہ یہ اختیار کیا جائے کہ انہیں اسمبلی سے بیجا توقعات وابستہ کرنے کی ترغیب دی جائے اور جب وہ ان کے حسبِ منشا پوری ہوتی نظر نہ آئیں تو اس "ناکامی" کو اسلامی نظام کی ناکامی کی دلیل کے طور پر پیش کر کے عوام کے اندر یہ گمراہ کن خیال پھیلایا جائے کہ اسلام نعوذ باللہ ناکام ہوا ہے۔ اس سازش سے ہمارے ملک کے ہر بہی خواہ کو پوری طرح واقف ہونا چاہیے۔ توقعات قائم کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ جو لوگ اس ملک میں دین کا کام کر رہے ہیں اُن سے یہاں کے عوام کو اچھی توقعات ہی رکھنی چاہئیں۔ مگر توقعات اور خوابوں کے محلات میں بہرحال ایک فرق ہے۔ توقعات ہمیشہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے وابستہ کرنا چاہئیں اور دیکھنا چاہیے کہ ان حالات میں کیا کام اور کتنا کام عملاً ممکن ہے۔

ہونے والے انتخابات کے نتائج کیا ہوں گے ان کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر اندازہ یہی ہے کہ اشتراکیت کے علمبردار اسمبلی میں اکثریت حاصل نہ کر سکیں گے۔ اسمبلی کے اندر اکثریت انشاء اللہ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے محافظوں کی ہوگی۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا محض ان لوگوں کے اسمبلی میں اکٹھا ہو جانے سے اسلامی نظام اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اس ملک میں برپا ہو سکیگا؟ اسلامی نظام کے قیام کے لیے صرف چند اسلام پسندوں کی اسمبلی کے اندر محض یکجائی کافی نہیں اس کے لیے چند ناگزیر شرائط بھی ہیں:

پہلی شرط تو یہ ہے کہ اسمبلی میں عظیم اکثریت ان لوگوں کی ہو جو محض اسلام کے نام لیوا نہ ہوں بلکہ فکر و عمل کے اعتبار سے واقعی مسلمان ہوں، اسلام کو جانتے بھی ہوں اور اس کے ساتھ گہری عقیدت اور وابستگی رکھتے ہوں، ان میں اتنی بصیرت ہو کہ موجودہ حالات میں اسلامی قوانین کا نفاذ حکمت کے ساتھ کر سکیں، اور ان کے درمیان پوری ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ حکومت کی مشینری میں ایسے مردانِ کار کی کافی تعداد موجود ہو جو اسلامی قوانین کے مطابق نظامِ حکومت چلانے کے خواہشمند بھی ہوں اور اس کی اہلیت بھی رکھتے ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو اور حکومت کی مشینری پر نظریات کے لحاظ سے بے دین اور کردار کے لحاظ سے بددیانت لوگوں کا قبضہ رہے تو محض اسمبلی کے اندر اسلامی قوانین کے نفاذ کا فیصلہ کر دینے سے وہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے جن کی جائز طور پر توقع کی جا سکتی ہے بلکہ اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ خود اسلامی قوانین کے بارے میں عوام کے اندر شکوک و شبہات پیدا ہونے شروع ہو جائیں۔

تیسری شرط یہ ہے کہ عوام کی اسلام سے وابستگی صرف نعرے بلند کرنے یا زیادہ سے زیادہ دیندار افراد کے حق میں ووٹ دینے تک ہی محدود نہ رہے بلکہ وہ فی الحقیقت اسلامی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے دل و جان سے خواہشمند ہوں اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کا سچا جذبہ رکھتے ہوں۔ اسلامی نظام کوئی جکڑبندیوں کا نظام نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو ایک آہنی شکنجے میں کس کر رکھ دے۔ بیشک انسان کو ناجائز کاموں سے باز رکھنے کے لیے اسلام نے کچھ حدود و قیود مقرر کی ہیں مگر محض ان حدود و قیود کے بل بوتے پر اسلامی نظام کی ساری برکات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان حدود و قیود کا معاملہ تو دینی سرحدوں کا سا ہے جنہیں پھاندنے کی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ مگر دین کا بیشتر حصہ تو ان سرحدوں کے اندر موجود ہے جہاں انسان اپنی دلی خواہش سے نیکی اور بھلائی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ عمل کے اس وسیع و عریض میدان میں اگر بے عملی کا مظاہرہ کیا جائے تو آخر مطلوبہ نتائج کس طرح برآمد ہو سکتے ہیں۔

ان واضح حقائق کو سامنے رکھ کر ہی قومی اسمبلی سے توقعات قائم کرنی چاہییں ورنہ یہاں کے عوام اسی مایوسی کے شکار ہوں گے جس کی آرزو بے دین طبقے مدت سے اپنے دلوں میں پال رہے ہیں۔ جو کچھ ان حالات میں ممکن ہے وہ یہی ہے کہ جمہوریت کی پٹڑی سے اتری ہوئی گاڑی پھر پٹڑی پر چڑھ جائے۔ ملک میں ایک نمائندہ حکومت قائم ہو جائے جو عوام کے سامنے جوابدہ ہو۔ اسمبلی کے اندر اسلامی عناصر کے ایک مضبوط گروہ کی موجودگی کے باعث بے دینی کے اس سیلاب کی کسی حد تک روک تھام ہو جائے۔ ملک میں اسلام کے لیے فضا سازگار کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور عوام کو معاشی ظلم سے بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ کیا جائے۔